پاکستان کا سفر

(دو ہفتوں کی خوش گوار یادیں)

——— سید جلال الدین عمری

ایک طویل عرصے سے پاکستان جانے، وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرنے اور دوستوں اور رفیقوں سے ملاقات کی خواہش دل میں موج زن تھی، لیکن ہر خواہش کا پورا ہونا اور جس وقت ہم چاہتے ہیں اس وقت پورا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دو پڑوسی ملک ہیں، لیکن ان کے درمیان سفر آسان نہیں رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کے سرد وگرم تعلقات بھی ہیں۔ ان تعلقات میں اس قدر نشیب و فراز رہا کہ کبھی سفر کا ارادہ ہوتا اور کبھی ٹوٹ جاتا۔ ایک مرتبہ ویزا بھی مل گیا اور میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی، لیکن اسی اثنا میں کارگل کا محاذ کھل گیا اور دونوں ملکوں کے حالات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔ اب بظاہر حالات میں تبدیلی آئی ہے اور بہ آسانی آمد ورفت شروع ہو گئی ہے۔ بہر حال بہت تاخیر سے سہی اس عاجز کے پاکستان جانے کی صورت نکل آئی۔ ۱۹/۲۰/۲۱/ مارچ ۲۰۰۵ء کو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں اجتماعی اجتہاد کے موضوع پر سیمینار تھا۔ اس میں شرکت کا دعوت نامہ محترم ڈاکٹر طاہر منصوری، صدر شعبۂ قانون کی جانب سے موصول ہوا اور میں نے دعوت قبول کر لی۔ سفارت خانہ پاکستان کو ایک دوست نے میرے ارادے کی اطلاع اور ویزا کی درخواست دی۔ سفارت خانہ نے بخوشی اسے منظور کر لیا۔ میں نے پاسپورٹ بھیج دیا اور ویزا مل گیا۔ پولیس رپورٹنگ سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس کے لیے میں سفارت خانہ پاکستان کا مشکور ہوں۔ سیمینار میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانا ہی تھا۔ اس کے ساتھ پاکستان کے دو بڑے علمی، تہذیبی اور سیاسی مراکز لاہور اور کراچی کو بھی میں نے اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ سفر کی پہلی منزل لاہور تھی۔

میرا ٹکٹ پی آئی اے (PIA) سے تھا۔ ۱۲/ مارچ ۲۰۰۵ء کی شام کو 5:30 بجے روانگی تھی۔ لیکن کسی قدر تاخیر سے جہاز روانہ ہوا۔ پچاس منٹ کی پرواز کے بعد پاکستانی وقت کے لحاظ سے 7:30 بجے جہاز لاہور پہنچا۔ لاہور کا نیا ہوائی اڈہ بہت وسیع، خوب صورت اور صاف ستھرا ہے۔ میرے ساتھ سامان بہت کم تھا۔ کسٹم والوں نے بھی تفتیش نہیں کی۔ ؎

خوشا راہی کہ سامانے نہ دارد۔

ایر پورٹ سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران تھا کہ ایک بندۂ عاجز و ناتواں کے استقبال کے لیے حافظ محمد ادریس صاحب ناظم اعلیٰ ادارۂ معارف اسلامی، جناب اشرف ملک اعوان صاحب نائب قیم جماعت اسلامی پاکستان، جناب عبدالغفار عزیز صاحب ناظم امورِ خارجہ جماعت اسلامی پاکستان طلبہ کے ساتھ موجود ہیں۔ ان سب حضرات سے پہلی ملاقات تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہر طرف سے محبت اور اخلاص کے پھول برس رہے ہوں۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی دوستوں سے تفصیلی تعارف شروع ہوگیا۔ ایئر پورٹ سے قیام گاہ کا فاصلہ ایک گھنٹہ میں طے ہوا۔ قیام گاہ پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اطلاع ملی کہ ایک اسلام پسند نوجوان کا ولیمہ ہے۔ اس میں شرکت اس کے لیے بھی اور اس کے عزیزوں کے لیے بھی خوشی کا باعث ہوگی۔ اس نوجوان کی شادی ایک ترک لڑکی سے ہوئی ہے۔ ولیمہ کی اس تقریب میں محترم قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان، نائب امراء چودھری رحمت الٰہی صاحب اور چودھری محمد اسلم صدیقی صاحب اور بعض دیگر ذمہ دار حضرات بھی شریک تھے ان سب سے غائبانہ واقفیت تو تھی ہی اب براہ راست تعارف کا موقع ملا۔ گو یہ ملاقات تھوڑی دیر کے لیے تھی لیکن فطری طور پر اس سے خوشی محسوس ہوئی۔

۱۳/ کی صبح ادارۂ معارف اسلامی لاہور میں حاضری دی، حافظ محمد ادریس صاحب نے تفصیل سے ادارہ کا تعارف کرایا۔ یہ ایک علمی ادارہ ہے۔ جہاں ریسرچ اور تحقیق کی ضروری سہولتیں موجود ہیں۔ اس کی اپنی لائبریری ہے۔ ریسرچ اسکالرز اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ تحقیقی کاموں میں ان کی مدد بھی کی جاتی ہے۔ ان کے تحقیقی مقالے یہاں جمع ہوتے ہیں۔

اسی سے متصل 'ترجمان القرآن' کا دفتر ہے۔ ترجمان القرآن پاکستان کا ایک معتبر

دینی وعلمی رسالہ ہے۔اس رسالے کے ساتھ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی یاد وابستہ ہے۔ اس نے امت کے ذہن وفکر کی تعمیر میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔اس کی ادارت کے فرائض کئی سال سے عالم اسلام کی معروف شخصیت پروفیسر خورشید احمد صاحب انجام دے رہے ہیں۔ معروف اسلامی مفکر اور مصنف، محترم جناب خرم مراد مرحوم کے برادر خورد جناب مسلم سجاد صاحب اس کے نائب مدیر ہیں۔ان سے بار بار ملاقات رہی اور ان کی نیک نفسی اور خلوص کے نقوش دل پر ثبت ہوتے رہے۔یہیں قریب ہی پروفیسر نصیر الدین ہمایوں نائب صدر تنظیم اساتذہ پاکستان کی قیام گاہ ہے۔ان کا شمار تعلیمات کے ماہر اساتذہ میں ہوتا ہے۔ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔اسلام آباد میں بھی ان کی رفاقت حاصل رہی۔

قریب ہی مکتبہ معارف اسلامی لاہور ہے۔اسے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میری کتاب 'عورت اسلامی معاشرے میں' کا پندرہواں ایڈیشن مکتبہ اسلامی پبلیشرز نے دو سال قبل شائع کیا ہے۔ہندوستان سے اس کے گیارہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ میری بعض اور کتابوں کے بھی چار پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر کتابیں مکتبہ اسلامی پبلیشرز سے شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ جس مکتبہ نے جو کتاب شائع کرنی چاہی، شائع کر دی۔ مجھے اس کی اطلاع تک نہیں دی۔اب بعض مکتبے ان کتابوں کو زیادہ اہتمام سے شائع کرنا چاہتے ہیں۔اللہ تعالیٰ مدد فرمائے۔

بعد نماز عصر پانچ بجے جماعت اسلامی لاہور نے اپنے دفتر میں استقبالیہ کا نظم کیا تھا۔تین چار سو افراد جمع تھے۔اسٹیج پر ملک محمد اشرف اعوان، حافظ سلیمان بٹ وغیرہ ذمہ دار افراد موجود تھے۔ ملک محمد اشرف اعوان صاحب نے عاجز کا تعارف کرایا اور خطاب کی دعوت دی۔ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات اور جماعت کی خدمات کا تعارف کرایا۔میں نے بتایا کہ اس وقت برصغیر میں جماعت اسلامی کے نام سے پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور کشمیر میں جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ان سب کا نصب العین گو اقامت دین ہے لیکن ان کے درمیان کسی قسم کا تنظیمی ربط نہیں ہے۔ ہر جماعت کا اپنے حالات کے لحاظ سے نقشۂ کار ہے اور وہ اس پر عمل کرتی ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے

اپنے لیے جو طریقہ کار تجویز کیا ہے اس میں اسلام کا تعارف اور اس کی دعوت، مسلم معاشرے کی اصلاح، تعلیم کی توسیع اور خدمت خلق کے کاموں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنے کارکنوں کی تربیت و اصلاح پر بھی خاص توجہ دیتی ہے۔

تقریر کے بعد پریس والوں نے سوال و جواب شروع کر دیے۔ اہل پاکستان کو ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی، معاشی، تہذیبی حالات سے خاص دلچسپی ہے۔ وہ مسلمانوں کی جان، مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ غیر مسلم سیاسی جماعتوں اور مسلمانوں کے سلسلے میں ان کا رویہ ان کے سوالات میں شامل ہوتا ہے۔ جماعت اسلامی کے متعلق بھی وہ سوالات کرتے ہیں۔ ان کا خاص موضوع مسئلہ کشمیر ہے جس کے بارے میں ہر موقع پر سوال کیا جاتا ہے۔ میں نے ہندوستانی نظام، اس کے دستور، اس میں اقلیتوں کے حقوق، موجودہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کی کوششوں کا مختصر ساذکر کیا۔ مسئلہ کشمیر کے بارے میں بتایا کہ یہ برصغیر کا پچاس سال سے زیادہ قدیم اور پے چیدہ مسئلہ ہے۔ اس کا حل ہم سب چاہتے ہیں، لیکن یہ حل بات چیت اور گفتگو ہی کے ذریعہ نکلنا چاہیے، جنگ اس کا حل نہیں ہے۔ اس مسئلے پر تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اب جنگ ہو گی تو بڑی تباہ کن ہو گی، اس لیے کہ اب یہ دونوں ایٹمی ملکوں کے درمیان جنگ ہو گی۔ اس سے دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ ان دونوں ممالک کو ایسا پر امن حل تلاش کرنا چاہیے جو کشمیریوں کے لیے بھی قابل قبول ہو۔

لاہور کے بیشتر اخبارات نے جن میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے اخبارات شامل ہیں، اس عاجز کی لاہور آمد اور سوال و جواب کو نمایاں طریقہ سے شائع کیا۔ لیکن افسوس کہ بعض باتوں کی صحیح رپورٹنگ نہیں ہو سکی۔ پاکستان کی اردو صحافت کا معیار ہندوستان کی اردو صحافت سے بلند ہے۔ دہلی، اتر پردیش اور بہار جو اردو کے مراکز ہیں یہاں کی اردو صحافت نیم جان بلکہ بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔ بمبئی اور حیدر آباد کے اخبارات اپنا ایک معیار رکھتے ہیں۔ پاکستان کے اردو اخبارات کا معیار وہاں کے انگریزی اخبارات سے کم نہیں ہے۔ ان کی اشاعت انگریزی اخبارات سے زیادہ ہے۔ البتہ گندگی اور بے حیائی کی اشاعت

ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ مشترک ہے۔ بہت کم اخبارات اس سے محفوظ ہیں۔

استقبالیہ سے فارغ ہو کر ملک محمد اشرف اعوان صاحب کے ساتھ اچھرہ پہنچا اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی قبر پر حاضری دی۔ مولانا کو میں نے نہیں دیکھا لیکن ان سے فکری رہنمائی حاصل کی ہے اور ان کے علم و فہم اور بصیرت سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ اس دور میں اسلام کے بے باک ترجمان اور بہترین شارح تھے۔ انہوں نے احیاء اسلام کا جذبہ بیدار کیا۔ یہ جذبہ آج بھی زندہ و تابندہ ہے۔ وہ جب تک زندہ رہے بہت سے دلوں کی دھڑکن بن کر رہے اور جب دنیا سے گئے تو اپنا ذکرِ خیر چھوڑ گئے۔ میں نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس خادمِ دین کی خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گل کی نگہبانی کرے

مولانا مرحوم کی قبر ہی کے قریب بیگم مودودیؒ کی بھی قبر ہے۔ اس اللہ کی بندی نے جس طرح ہر نشیب و فراز میں مولانا کا ساتھ دیا اور حقِ رفاقت ادا کیا وہ خود ایک مثال ہے۔

مولاناؒ جس آفس میں بیٹھتے تھے، رات ہونے کی وجہ سے وہ بند تھا، مولاناؒ کے صاحب زادوں سید حیدر فاروق مودودی اور سید حسین مودودی سے تھوڑی دیر ملاقات رہی۔ اس کے بعد قیام گاہ واپسی ہوئی۔

۱۵/مارچ کا دن بھی بڑی مصروفیت کا رہا۔ صبح مولانا مودودیؒ انسٹی ٹیوٹ دیکھا اور وہاں کے طلبہ سے خطاب کیا۔ یہاں ہائی اسکول پاس طلبہ کے لیے دینی تعلیم کا دو سالہ کورس ہے۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی اور عربی ہے۔ طلبہ نے مختصر سا پروگرام پیش کیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ ان زبانوں میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ طلبہ کے پروگرام کے بعد مجھ سے خطاب کی فرمائش ہوئی تو میں نے اس بات پر زور دیا۔

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نہ تواں خدا را شناخت

علم کی راہ میں ہمارے اسلاف کی محنت اور کدو کاوش کی بعض مثالیں پیش کیں اور

کہا کہ ادارہ جن اعلیٰ مقاصد کے لیے قائم ہوا ہے، اساتذہ اور طلبہ انہیں ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

جامعۃ المحصنات کے نام سے پاکستان میں دس گیارہ ادارے قائم ہیں۔ یہ ایک ٹرسٹ کے تحت چلائے جارہے ہیں۔ اس کا تعلیمی نظام رابطۃ المدارس بورڈ کے تحت ہے۔ کم از کم میٹرک پاس طالبات کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ جو طالبات انگلش میں انٹر (F.A) کرنا چاہتی ہیں ان کے لیے اس کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ یہ ادارے ابھی ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ آگے کے مراحل پر عمل درآمد ہو تو اسلامی جذبات سے معمور طالبات تیار ہوسکتی ہیں۔ یہاں کی معلمات اور طالبات سے خطاب کا موقع ملا۔ جماعت اسلامی ہند تعلیم کے میدان میں کافی آگے ہے۔ اس کے اراکین اور کارکنوں کے ذریعہ خواتین کی دینی تعلیم کے متعدد ادارے چل رہے ہیں اور بڑی جامعات بھی موجود ہیں۔

بعد مغرب (6:30) ادارۂ معارفِ اسلامی لاہور کی طرف سے مختصر سی علمی نشست کا اہتمام تھا۔ اس کے لیے دعوت نامے جاری کیے گئے تھے۔ لیکن توقع سے زیادہ افراد نے شرکت کی۔ اس عاجز نے اپنے اظہارِ خیال میں عرض کیا۔ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ مادیت کا غلبہ ہے۔ مادیت انسان کے فکر وعمل، تہذیب وتمدن، معیشت وسیاست ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ مذہب واخلاق بھی اس کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔ آدمی اس سے اوپر اٹھ کر سوچنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ صورتِ حال بڑی بھیانک ہے لیکن نئی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں کو اسی صورتِ حال سے سابقہ پیش آتا رہا ہے۔ محمد ﷺ کی جب بعثت ہوئی تو دنیا اسی مادیت میں گرفتار تھی۔ اس کی وجہ سے ہر طرف ظلم واستحصال تھا، حقوق پامال ہورہے تھے، اور سماج عدل وانصاف سے محروم تھا۔ محمد ﷺ نے یہ حقیقت واضح کی کہ اس بگاڑ کی اصل وجہ خدا اور رسول کا انکار اور آخرت فراموشی ہے۔ اگر خدا کا تصور واضح ہو، انسان اس کی ہدایت کو تسلیم کرے اور یہ بات مان لے کہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی ہی اصل ہے تو وہ مادیت کی دلدل سے نکل سکتا ہے۔ دنیا ظلم سے پاک ہوسکتی اور نظامِ حیات امن وامان اور عدل وانصاف پر قائم ہوسکتا ہے اور اس کی آخرت بھی سنور سکتی ہے۔ یہی کام آج کرنے کا ہے۔

تقریر کے بعد تھوڑی دیر سوال وجواب کا سلسلہ رہا۔ اس مجلس کی رپورٹ

پاکستان کے سینیئر صحافی اور مشہور کالم نگار عطاء الرحمان صاحب نے روزنامہ نوائے وقت میں شائع کی۔اس کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

''مولانا جلال الدین عمری، جماعت اسلامی ہند کے نائب امیر اور مسلمانانِ بھارت کی سر برآوردہ علمی شخصیت، اسلام اور دورِ حاضر کو درپیش مسائل سے متعلق کئی موضوعات پر علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ علی گڑھ سے شائع ہونے والے سہ ماہی (مجلّہ) 'تحقیقات اسلامی' کے مدیر اور اعظم گڑھ میں قائم ممتاز درس گاہ جامعۃ الفلاح کے شیخ الجامعہ بھی ہیں۔ یوں ان کی ذات میں علم، تحقیق، تعلیم و تدریس اور توسیعِ علم کے اوصاف جمع ہو گئے ہیں۔ مولانا جلال الدین عمری ان دنوں اسلام آباد کے سرکاری ادارے تحقیقاتِ اسلامی کے زیر اہتمام 'اجتہاد' پر ہونے والی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ گزشتہ شب ادارۂ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور نے ان کے ساتھ نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ مولانا عمری نے بیس منٹ تک خطاب کیا پھر جچے تلے انداز میں سوالات کے جواب دیے۔ سید منور حسن میرِ محفل تھے، مولانا محمد ادریس مہتمم کے فرائض سر انجام دے رہے تھے۔ مولانا جلال الدین عمری نے آغازِ کلام کیا گویا دبستاں کھل گیا۔ ایک مدت کے بعد گنگا اور جمنا میں ڈھلی ہوئی زبان سننے کا اتفاق ہوا۔ پچھلے ہفتے اسلام آباد میں 'اردو ہے جس کا نام' کے زیرِ عنوان ایک عالمی کانفرنس ہوئی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق بڑے بڑے ادیب اور شعراء شریک ہوئے۔ زبان و کلام اور اظہار کے مختلف پہلو اور نت نئے اسالیب اس میں سامنے آئے ہوں گے، لیکن مولانا عمری کا لہجہ، طرزِ تکلم، الفاظ کا انتخاب، ان کی ادئیگی' اس پر مستزاد مسلمانانِ یوپی و دہلی کی تہذیبی روایات کی انعکاسی کرنے والی وضع قطع سب نے مل کر ایسا سماں باندھا کہ گزرا ہوا عہد آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، میری نسل کے جن اہلِ پاکستان نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ان کے بڑے بھائی مولانا ابوالخیر مودودیؒ، مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم حبیب اشعر، خواجہ محمد شفیع دہلوی اور حکیم سعید دہلوی جیسی شخصیات میں رچی بسی اس تہذیب کی جھلکیاں دیکھی ہیں۔ ان کے لیے مولانا جلال الدین عمری کی یہ نشست یوں سمجھئے کہ قندِ مکرر کا لطف دے گئی۔''

(نوائے وقت ۱۷/ مارچ ۲۰۰۵ء)

ان الفاظ میں حقیقت سے زیادہ محبت اور خلوص کا اظہار ہے۔ اسے ایک مہمان کی تکریم اور ہمت افزائی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وقت کے اکابر کے ساتھ ایک چھوٹے فرد کا نام بھی شامل کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اور اس حسنِ ظن کو پورا کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔

جب سے علمی دنیا سے تعارف ہوا پنجاب یونیورسٹی کا نام سن رکھا تھا۔ یہ برّصغیر کی ان قدیم یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے جنھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ اس کی بڑی خدمات ہیں۔ لاہور ایئر پورٹ سے جب ہم پنجاب یونیورسٹی کے کیمپس کے قریب سے گزرے تو اسے دیکھنے کی خواہش ابھر آئی اور یہ طے ہوا کہ اس کا موقع ضرور نکالا جائے گا۔ اسی اثناء میں یونیورسٹی کے شعبۂ علومِ اسلامیہ کی جانب سے 'اسلامی تحقیق کی ضرورت، اہمیت اور طریقِ کار' کے موضوع پر خطاب کی دعوت دی گئی۔ میں نے بخوشی اسے منظور کر لیا۔ ۱۶؍ مارچ ۲۰۰۵ء کو صبح دس بجے پروگرام شروع ہوا۔ آڈیٹوریم میں شعبہ کے اساتذہ کرام کے علاوہ ایم اے، ایم فل اور پی، ایچ، ڈی کے طلبہ و طالبات کئی سو کی تعداد میں موجود تھے۔ حسبِ معمول تعارف کے بعد اظہارِ خیال کے لئے کہا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ اسلامیات پر تحقیقی کام افراد کے ذریعہ بھی اور دینی اداروں، جامعات اور یونیورسٹیوں کے ذریعہ بھی ہوتا رہا ہے اور بعض بڑے قابلِ قدر کام انجام پائے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے کام بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کی نوعیت تاریخی ہے۔ جیسے افراد کی سوانح، خدمات یا کسی خاص دور کا مطالعہ اور جائزہ۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے ماضی کی صحیح صورت حال سامنے آتی ہے، غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں اور ان سے سبق بھی سیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرا کام مخطوطات کے ایڈٹ کرنے کا ہوتا ہے۔ اس سے قدیم مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے تصحیح کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور استفادہ آسان ہوتا ہے۔ یہ علم کی بڑی خدمت ہے۔ اس میدان میں ماضی قریب میں عرب مصنفین نے قدیم عربی تصنیفات کی جس دقتِ نظر سے تحقیق کی اور انھیں ایڈٹ کیا ہے اس میں وہ سب سے آگے نظر آتے ہیں۔

دینی علوم کے ماہرین اور دینی اداروں کے موضوعات بالعموم وہ ہوتے ہیں جو خود ان کے درمیان زیرِ بحث رہتے ہیں۔ جیسے توحید، شرک، بدعت، فہمِ قرآن، فہمِ حدیث ان کی تعبیر وتشریح میں اختلاف، فقہی مسائل میں راجح مسلک کی تعیین وغیرہ۔ اس طرح کے مسائل پر ضخیم کتابیں اور رسائل لکھے گیے ہیں اور ہر ایک نے تحقیق کا حق ادا کرنے کی ممکن حد تک کوشش کی ہے۔ لیکن کچھ مسائل وہ بھی ہیں جو عالمی سطح پر زیرِ بحث ہیں اور ان کی طرف اسلامی محققین کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آج خدا کا وجود، رسالت کا ثبوت اور آخرت کا امکان ہی زیرِ بحث ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہی بات نا قابلِ تصور ہے کہ اسلام جو پندرہ سو سال قبل آیا تھا آج بھی اس کی معنویت باقی ہے اور وہ نا قابلِ تغیر ہے۔ اسی طرح اسلام کی معاشرت، اس کے قوانینِ حدود وقصاص، عورت اور مرد کے حقوق اور ان کے دائرۂ کار، اسلام کا سیاسی فکر، اسلام کا تصورِ عدل ومساوات، غیر مسلموں سے تعلقات اور غیر اسلامی ریاست میں مسلمانوں کا کردار جیسے بہت سے موضوعات ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان موضوعات پر کام نہیں ہوا ہے۔ بہت سی قیمتی تحقیقات موجود ہیں لیکن اس کے باوجود یہ مزید تحقیق اور غور وفکر کا تقاضا کرتے ہیں۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد صدرِ شعبہ کے ساتھ لائبریری دیکھنے کا موقع ملا۔ خاصی بڑی لائبریری ہے اور ریسرچ اسکالرس کی ضروریات بڑی حد تک پوری کر سکتی ہے۔

اس کے فوراً ہی بعد یونیوسٹی کے 'ادارۂ تعلیم وتحقیق' کے اساتذہ کے ساتھ نشست تھی۔ بیس پچیس افراد شریک تھے۔ ان میں علمی موضوعات کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان کے حالات بھی زیرِ بحث رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کا نیا کیمپس کافی وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔ درمیان میں نہر ہے اس کی وجہ سے منظر بڑا خوش نما ہے۔ اس کے سرسری معائنہ کے لیے بھی کافی وقت چاہیے تھا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کچھ حصہ دیکھنے کا موقع ملا۔ دیر گئے واپسی ہوئی۔

۱۶ر مارچ کو بعد عشاء ۸:۳۰ بجے سید منور حسن صاحب قیم جماعت اسلامی پاکستان نے مرکزِ جماعت میں 'تقریبِ ملاقات' کا اہتمام کیا۔ اس میں لاہور میں موجود جماعت کے ذمہ دار اصحاب، اور بعض دوسرے احباب شریک ہوئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ

بہ یک وقت ان سب حضرات سے تعارف وملاقات کا موقع نکل آیا۔ سید منور حسن صاحب کے ابتدائی کلمات کے بعد محترم قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعت اسلامی پاکستان نے وحدتِ امت کے تصور پر اظہارِ خیال فرمایا کہ مسلمان کسی بھی ملک میں ہوں، کوئی بھی زبان بولتے ہوں اور ان کے کتنے ہی رنگ روپ ہوں وہ سب ایک ہیں۔ اسلام نے ان سب کو ایک امت بنایا ہے۔ ان سب کا مقصدِ حیات ایک ہے اور سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس امت کو اسلام ہی نے ایک رشتۂ وحدت میں پرویا ہے۔ اگر اس کے اندر یہ احساس جاگ اٹھے تو اس کا انتشار دور ہوسکتا ہے اور وہ اتحاد واتفاق کی منزل کی طرف پیش قدمی کرسکتی ہے۔ اس سے عالمی سطح پر اس کے بہت سے مسائل حل ہوسکتے ہیں اور اس کی سربلندی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

محترم قاضی صاحب کی تقریر کے بعد مجھے اظہارِ خیال کا حکم ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ اس دور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ مختلف ملکوں میں اسلامی تحریکات کام کر رہی ہیں۔ ان سب کا مقصد اقامتِ دین ہے۔ اقامتِ دین کا تصور بڑا وسیع ہے۔ اس کا تعلق فرد، معاشرے اور ریاست ہر ایک سے ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ فرد کا اپنی ذات پر دین قائم کرنا ہے۔ اس پر ہماری اصل توجہ ہونی چاہیے۔ اس کے بعد ہی سماج اور ریاست پر دین کا قائم کرنا آسان ہوگا۔ اقامتِ دین کا کام دعوتِ دین سے شروع ہوتا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں جماعتِ اسلامی ہند کی کوششوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ جماعت نے ہندوستان کی تمام بڑی زبانوں میں قرآن وحدیث کے تراجم اور اسلامی لٹریچر تیار کیا ہے، اور اسے عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ دلچسپی سے یہ باتیں سنی گئیں۔ پروگرام کے بعد عشائیہ تھا جس میں سبھی حضرات نے شرکت کی۔

ان چار دنوں میں کئی ایک اخبارات نے بہت تفصیل سے انٹرویو لیے۔ ان انٹرویوز میں ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال، اس کا سیکولر کردار، مسلمانوں کی تعلیمی کوششیں، مدارس کا نصاب، موجودہ دور میں اجتہاد کی اہمیت، جماعت اسلامی کی خدمات، مسلم تنظیموں کی حالت، اسلام کی دعوت اور اس کے اثرات اور مسلمانوں کو درپیش دیگر بہت

سے مسائل شامل تھے۔ہفت روزہ 'تکبیر' کراچی کے نمائندے نے تین صفحات پر مشتمل اپنے انٹرویو پر حسبِ ذیل نوٹ لکھا جس سے سوالات کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

''جماعتِ اسلامی ہند کے نائب امیر سید جلال الدین عمری گزشتہ دنوں لاہور تشریف لائے تو خواہش ہوئی کہ ان کے خیالات کی روشنی میں یہ دیکھا جائے کہ ایک مذہبی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے ان کی نظر میں بھارت کے سیاسی منظرنامے کے خدوخال کیا ہیں۔ ہندو غلبہ رکھنے والے معاشرے میں عام شہری بن کر رہنے اور ایک اسلامی جماعت کے قائد کے طور پر شب و روز گزارنے میں کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ پاکستان اور بھارت کے مابین بہتر تعلقات کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، بھارت کے مسلمان اور بالخصوص ہندو اکثریت اس میں کتنی دلچسپی رکھتی ہے۔عام مسلمانوں کی بھارت میں کیا حالت ہے۔ وہ کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ملکی سیاست میں ان کا کیا کردار ہے۔انہیں کوئی فیصلہ کن پوزیشن حاصل ہے یا نہیں۔ سماجی لحاظ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ ان سے کی جانے والی گفتگو میں یہ جاننے کا موقع ملا کہ وہ اپنے ملک بھارت کے معاملات کو کس انداز سے دیکھتے ہیں'' (ہفت روزہ تکبیر ۱۷ تا ۲۳ مارچ ۲۰۰۵ء)۔

اس سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق پاکستانی عوام کے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کیا ہیں اور وہ کس قسم کی معلومات چاہتے ہیں؟ ان سوالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی حالت زیرِ بحث نہیں آئی۔اس سے دلچسپی بھی کم ہی دیکھنے میں آئی۔

روزنامہ 'جسارت' کراچی کے ہفت روزہ ایڈیشن 'فرائڈے اسپیشل' اور ہفت روزہ 'ایشیا' کے انٹرویوز بھی خاصے طویل اور ان اخبارات کے پانچ چھ صفحات پر پھیلے ہوئے تھے۔ روزنامہ 'پاکستان' کا شمار وہاں کے بڑے اخبارات میں ہوتا ہے۔اس نے پورے ایک صفحہ پر انٹرویو شائع کیا۔ ان اخبارات نے اس عاجز کے خیالات کو جو اہمیت دی اس کے لئے میں شکرگزار ہوں،گو کہ بعض مسائل میں میرے خیالات کی صحیح ترجمانی نہیں ہو سکی۔ بعض دوسرے اخبارات کے انٹرویز مجھے نہیں مل سکے۔

۱۷ رمارچ کو لاہور کی سیر کا پروگرام تھا لیکن اس سے پہلے صبح نو بجے جامعہ مرکز علوم اسلامیہ لاہور میں اساتذہ وطلبا سے خطاب تھا۔ اس سے فارغ ہوکر جناب ملک محمد اشرف اعوان صاحب کے ساتھ لاہور کی سیر کے لئے نکلا۔ حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت علی ہجویریؒ کا مقبرہ یا مزار شہنشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا اس لیے اس میں اس دور کے فنِ تعمیر کی شان نظر آتی ہے۔ بھٹو صاحب نے اپنے دورِ حکومت میں اس کے گیٹ پر سونے کی چادر چڑھائی تھی۔ آج کل یہ محکمۂ اوقاف کی تحویل میں ہے۔ مقبرہ کے چاروں طرف وہی منظر دیکھا جو ہندوستان کی درگاہوں میں نظر آتا ہے۔ مزار پر نذرانے چڑھ رہے تھے، اس کے سامنے سجدے ہو رہے تھے، دعائیں کی جارہی تھیں اور صاحبِ مزار سے استعانت واستمداد کے عمل میں سیکڑوں مرد وخواتین شریک تھے۔ یہ اس امت کا حال ہے جو توحیدِ خالص کی علم بردار ہے۔ مزار کے احاطے سے باہر نکلے ہی تھے کہ تیز بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا لیکن ہمارا سفر جاری رہا۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی شاہی مسجد، مزارِ اقبال، منارۂ پاکستان وغیرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۷ رمارچ کی شب میں یہ عاجز اسلام آباد اس احساس کے ساتھ روانہ ہوا کہ لاہور مزید وقت کا تقاضا کرتا ہے۔ یہاں کے بہت سے قدیم وجدید ادارے ہیں جنہیں دیکھنا چاہیے تھا۔ بہت سی دینی، علمی وادبی شخصیتیں ہیں جن سے ملاقات کرنی تھی جو نہیں ہوسکی۔

دوستوں نے لاہور ایئرپورٹ پر الوداع کہا اور میں اسلام آباد روانہ ہوگیا۔ جہاز کسی قدر تاخیر سے روانہ ہوا اور 9:30 بجے کے قریب اسلام آباد پہنچا۔ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ سے میری ملاقات سعودی عرب کی ہے جب کہ وہ مکہ مکرمہ میں زیرِ تعلیم تھے۔ یونیورسٹی کی گاڑی میں ہم لوگ روانہ ہوئے۔ رات کا وقت تھا۔ راولپنڈی اور اسلام آباد کا فطری حسن بجلی کی روشنی میں اپنے جلوے دکھا رہا تھا۔ ہم لوگ سیدھے ہوٹل چٹو رایل (Chateau Royal) پہنچے۔ یونیورسٹی کی طرف سے یہیں قیام کا انتظام تھا۔ ہوٹل ہی میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور رات گئے ڈاکٹر عصمت اللہ روانہ ہوگئے۔ صبح ڈاکٹر محمد طاہر منصوری صدر شعبۂ اسلامی قانون

اسلامی یونیورسٹی ہوٹل تشریف لائے۔ وہ سیمینار کے آرگنائزر اور روحِ رواں تھے۔ اس کے لئے انہوں نے اس عاجز سے مسلسل رابطہ رکھا۔ وہ عربی اور اردو میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ روانہ ہوئے ہی تھے کہ محترم ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری تشریف لے آئے، جو اسلامی یونیورسٹی میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔ اسی کے تحت سیمینار ہو رہا تھا۔ سیمینار میں شرکت کا باضابطہ دعوت نامہ انہیں کی طرف سے تھا۔ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری علمی دنیا کی معروف شخصیت اور انگریزی کے ادیب ہیں۔ اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر (LEICESTER) لندن سے بھی ان کا تعلق ہے۔ انہوں نے مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن کے تین حصوں کا بعض دوسرے رفقاء کی مدد سے ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ اسے ایڈٹ بھی کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ اب انہوں نے مولانا کے ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی کا ترجمہ مکمل کر لیا ہے جو اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ بڑی نستعلیق اور مہذب شخصیت ہے۔ بہت دھیمے اور شائستہ انداز میں بولتے ہیں۔ بڑی اپنائیت کے ساتھ خیریت اور حالات معلوم کرتے رہے اور یونیورسٹی آنے کی دعوت دے کر روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد یونیورسٹی کی گاڑی آ گئی۔ میں ان کے دفتر پہنچا، وہاں شعبہ کے بعض اساتذہ سے تعارف حاصل ہوا۔

۱۸/ مارچ جمعہ کا دن تھا۔ ڈاکٹر محمد طاہر منصوری کے ساتھ فیصل مسجد میں نماز پڑھی۔ فیصل مسجد بڑی کشادہ اور بہت خوب صورت ہے۔ نئی مسجدوں میں شاید ہند و پاک میں کوئی مسجد اتنی خوب صورت اور وسیع نہ ہوگی۔ مسجد اور اس کے حسنِ انتظام کو دیکھ کر انبساط اور سرور کی کیفیت محسوس ہوئی۔ بتایا گیا کہ اس حسین مسجد میں دو لاکھ افراد بہ یک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد میں خواتین کے لئے بھی نماز کا انتظام ہے اور خواتین شریک ہوتی بھی ہیں۔ جمعہ میں خواتین کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اس لئے پوری مسجد دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ ہم لوگ مسجد پہنچے تو جامعہ کی مشہور شخصیت ڈاکٹر خالد مسعود صاحب تقریر کر رہے تھے۔ عالمِ اسلام کے معروف عالم اور فقیہ وھبہ زحیلی نے، جن کی کتاب 'الفقہ الاسلامی وأدلتہ' اسلامی فقہ پر ایک دائرۃ المعارف ہے، جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ نماز

کے بعد ڈاکٹر محمد طاہر منصوری کے ساتھ اپنے مستقر ہوٹل پہنچا اور شام تک دوستوں سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۹/ مارچ کو صبح 10:30 بجے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے خوب صورت آڈیٹوریم میں سیمینار شروع ہوا۔ سیمینار کا موضوع تھا 'اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء، اور عملی صورتیں'۔ اجتہاد کی اہمیت وضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شریعت کے دائمی اور ابدی ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہر دور میں انفرادی اجتہاد ہوتا رہا ہے، یا سابقہ اجتہادات کی روشنی میں فتوے دیے گئے یا فیصلے ہوئے ہیں لیکن موجودہ دور میں حالات اتنے بدل گئے ہیں اور مسائل اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ کسی ایک فرد کے لئے شریعت کی روشنی میں ہر معاملہ میں رہنمائی کرنا دشوار ہے، اس لئے یہ رجحان ابھر رہا ہے کہ اجتہاد اجتماعی ہو۔ پیش نظر مسائل سے واقف کار افراد اور دین وشریعت کے ماہرین مل بیٹھیں اور آپس کے تبادلۂ خیال کے بعد اسلام کا موقف واضح کریں۔ اس مسئلے میں اللہ کا شکر ہے کہ مختلف ممالک میں علمی ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان میں ہندوستان کی اسلامک فقہ اکیڈمی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ لیکن ابھی یہ طریقۂ کار عام نہیں ہے۔ اس پس منظر میں سیمینار کا موضوع اہم تھا۔ اسے اجتہاد کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد طاہر منصوری نے سیمینار کا بہت خوب صورت الفاظ میں تعارف پیش کیا۔ خیر مقدمی کلمات ڈاکٹر اسحاق انصاری کے تھے۔ ان کے اندازِ گفتگو کی طرح ان کی تحریر سے بھی تہذیب وشائستگی اور متانت کا اظہار ہوتا ہے۔

کلیدی خطبہ ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کا تھا۔ محترم ڈاکٹر محمود غازی صاحب سے لیسٹر میں کئی سال قبل ایک ہفتے سے زیادہ کی رفاقت رہی ہے۔ سعودی عرب میں بھی ان سے تھوڑی دیر کے لئے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ایک معتبر علمی شخصیت ہیں۔ دینی علوم اور جدید افکار ونظریات سے براہِ راست واقف ہیں۔ میری دو کتابوں (مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ اور اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور) کے انگریزی تراجم پر ان کے تفصیلی تبصرے اسلامک بک ریویو لسٹر میں شائع ہو چکے ہیں۔ سیمینار کے دوران میں

ان سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔

ڈاکٹر وھبہ زحیلی سیمینار کے مہمانِ خصوصی تھے۔ ان کی شرکت اور خطاب نے سیمینار کے وقار میں اضافہ کیا۔ فقہ کے میدان میں اس وقت انہیں امامت کا درجہ حاصل ہے۔

آخر میں جناب وسیم سجاد صاحب سابق چیرمین سنیٹ نے صدارتی خطبہ پیش فرمایا۔

کلماتِ تشکر جناب خلیل الرحمٰن صاحب ریکٹر جامعہ اسلامیہ نے ادا کیے۔ وہ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ تین سال قبل حج میں تقریباً ایک ہفتہ ان کا ساتھ رہا۔ ان کی وضع قطع علماء کی سی ہے اور سیرت و اخلاق میں جاذبیت پائی جاتی ہے۔ انہیں حج کے ایام کی رفاقت یاد تھی۔ بڑی محبت سے ملے۔

سیمینار میں ہندوستان سے اس خاکسار کے علاوہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی نئی دہلی، مولانا محمد سعود عالم قاسمی، ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور مولانا فہیم اختر ندوی نے شرکت کی۔

سیمینار کی مختلف نشستیں رہیں۔ پہلی نشست اس عاجز کی صدارت میں ہوئی۔ موضوع تھا 'اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء، شرعی حیثیت اور اصول وضوابط'۔ اس پر کئی پہلوؤں سے گفتگو ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ اجتماعی اجتہاد دراصل باہم مشورے سے کسی نتیجے تک پہنچنے کا نام ہے۔ ہمارے فقہاء نے قضا کے جو آداب بیان کئے ہیں ان میں اہلِ علم سے مشورہ بھی شامل ہے۔ اسے اجماع تو نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ اجماع کی طرف ایک طرح کی پیش قدمی ہے۔ اجتماعی غور وفکر کی اسلامی تاریخ میں دورِ اول سے روایت رہی ہے اور مسائل پر مل جل کر غور وفکر ہوتا رہا ہے۔ البتہ فقہِ اسلامی کے مطالعہ سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون سا اجتہاد انفرادی ہے اور کون سا اجتہاد اجتماعی ہے۔ اسی طرح اس کے اصول وضوابط بھی متعین نہیں ہیں، ان کی تعیین کی کوشش ہونی چاہیے۔

سیمینار کا آخری اجلاس برادرم خالد سیف اللہ رحمانی کی صدارت میں ہوا جس کا موضوع تھا 'اجتماعی اجتہاد اور اہم عصری مسائل'۔ اس طرح سمینار کے آغاز اور اختتام کا اعزاز دو ہندوستانیوں کو حاصل ہوا۔

سیمینار کی خاص بات یہ تھی کہ پہلے اور دوسرے روز بعد مغرب توسیعی خطابات تھے۔ پہلے روز اس عاجز کا اور مولانا جاوید احمد غامدی صاحب کا خطاب تھا۔ جاوید احمد غامدی صاحب اپنے بعض نئے خیالات کی وجہ سے وہاں زیرِ بحث رہتے ہیں۔ بجلی کی خرابی کی وجہ سے میں آڈیٹوریم میں دیر سے پہنچا۔ ان کی تقریر سے استفادہ نہ کر سکا۔ میں نے اپنے خطاب میں کہا کہ عبادات اور معاشرت کے احکام شریعت میں تفصیل سے بیان کر دیے گئے ہیں جن میں اجتہاد کی ضرورت کم ہی پیش آتی ہے۔ اس سلسلے میں جو طویل بحثیں ہمارے ہاں موجود ہیں ان کا تعلق زیادہ تر اس امر سے ہے کہ احکام کی نوعیت کیا ہے اور یہ کس شکل میں انجام دیئے جائیں گے اور ان پر صحابۂ کرام کا کس طرح عمل ہوتا رہا ہے۔ اجتہاد کی ضرورت عام طور پر معاملات اور سیاسی امور و مسائل میں پیش آتی ہے۔ ان میں شریعت نے زیادہ تر اصولی ہدایات دی ہیں۔ موجودہ حالات پر ان کا انطباق اور ان کی روشنی میں اسلامی احکام کو معلوم کرنا ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت اجتہاد ہی کے ذریعہ پوری ہو سکتی ہے اور اس میں اجتماعی کوشش بھی ہونی چاہیے۔ سیمینار کی صدارت محترم مولانا محمود احمد غازی صاحب، صدر اسلامی یونیورسٹی فرما رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جن دو اصحاب نے اس وقت خطاب کیا بعض مسائل میں ان کا اندازِ فکر مختلف ہو سکتا ہے لیکن ہمیں خوشی ہے کہ اجتہاد کی ضرورت، اس کے دائرۂ کار اور اجتماعی اجتہاد کی ضرورت پر ان کا اتفاق ہے۔

سیمینار کے دوسرے روز بھی ڈاکٹر محمد خالد علوی کی صدارت میں توسیعی خطابات کا پروگرام تھا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا ابوعمار زاہد راشدی صاحب نے خطاب کیا۔ مولانا زاہد راشدی کا زور اس بات پر تھا کہ پاکستان میں اجتماعی اجتہاد کا عمل جاری ہے۔ انہوں نے سیاسی طور پر جو مشترکہ کوششیں ہوئیں انہیں اجتماعی اجتہاد قرار دیا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے سنجیدہ انداز میں اس سے اختلاف کیا اور اس کی نوعیت واضح کی۔ آخر میں ڈاکٹر خالد علوی صاحب کے خطاب سے اس کی مزید وضاحت ہوئی۔

۲۱ر مارچ کو سیمینار ہی سے متعلق پاکستانی ٹیلی ویژن سے ڈاکٹر خالد مسعود علوی، مولانا عبدالرحمٰن مدنی اور اس عاجز کا پروگرام نشر ہوا۔ سوالات اجتماعی اجتہاد اور پارلیمنٹ کے

حقِ اجتہاد اور عورت کی امامت وغیرہ سے متعلق تھے۔ میں نے عورت کی امامت کے ذیل میں عرض کیا کہ اس پر امت کا اتفاق ہے کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کرسکتی۔ دورِ اول سے آج تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے البتہ اس میں اختلاف ہے کہ عورت عورتوں کی جماعت کی امامت کرسکتی ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں یہ جائز ہے اور سلف سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

اسی روز جناب ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کی صدارت میں میں نے اپنا مضمون 'دارالاسلام اور دارالکتاب کا تصور جدید عالم گیریت کے سیاق میں' پیش کیا۔ میں نے عرض کیا کہ فقہاء نے یہ تقسیم اپنے دور کے پس منظر میں کی ہے۔ اس کی بنیاد پر پورے اسلام کے تصورِ سیاست پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ درست نہیں ہیں، البتہ یہ تقسیم جن مخصوص حالت میں کی گئی تھی وہ تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

مجھے دل چسپی صحت کے موضوع سے رہی ہے۔ چنانچہ 'صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات' کے عنوان سے میری ایک ضخیم کتاب ۱۹۹۴ء میں شائع ہوچکی ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کا ملیالم زبان میں ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب نے کویت کے ادارے 'المنظمۃ العالمیۃ للعلوم الطبیہ' پر اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس ادارہ نے اس موضوع پر خاصا کام کیا ہے اور متعدد سمینار کر چکا ہے اور اس کی تحقیقات بھی سامنے آ چکی ہیں۔ افسوس کہ اس ادارہ سے میرا کوئی ربط نہیں رہا ورنہ اس کی معلومات سے استفادہ کیا جا سکتا تھا اور میری کتاب بھی شاید ادارہ کے لیے قابلِ توجہ ہوتی اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا۔

سیمینار کا ابتدائی خاکہ بہت خوب صورت اور جامع تھا جس میں بہت سے نئے موضوعات کی نشان دہی کی گئی تھی لیکن چند ایک موضوعات ہی زیر بحث آ سکے۔ سیمینار میں گوکہ مختلف حلقوں کی نمائندگی تھی لیکن یہ اس سے زیادہ نمائندہ ہوسکتا تھا۔ خود پاکستان کے بعض بڑے اداروں اور اہم شخصیات کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ سیمیناروں میں مقالات پڑھے تو جاتے ہیں لیکن بالعموم نتیجہ خیز گفتگو نہیں ہو پاتی، یہ صورت حال یہاں بھی رہی۔ سیمینار کے آخر میں بعض قراردادیں منظور کی گئیں۔

تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان کی راجدھانی کراچی تھی۔صدر ایوب خاں کے دور میں راجدھانی اسلام آباد منتقل ہوگئی۔اسلام آباد کا محل وقوع بڑا حسین اور خوب صورت ہے۔سرسبز وشاداب اور رنگین پہاڑیوں کے درمیان واقع یہ شہر اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتا ہے،مزید یہ کہ اسے ایک منصوبے کے تحت اس طرح بسایا جا رہا ہے کہ اس کا فطری حسن متاثر نہ ہو۔ایک سیکڑ اور دوسرے سیکڑ کے درمیان خاصی طویل سبز پٹی (Green Belt) ہے۔اس کے اطراف واکناف کے علاقے بھی اپنی خوب صورتی کے لئے مشہور ہیں۔ خاص طور پر 'مرّی' کا ذکر آتا رہا ہے۔جی چاہتا تھا کہ ان مقامات کو گھوم پھر کر دیکھا جائے، لیکن سمینار کے دوران میں مسلسل بارش کی وجہ سے اس گل گشت کا موقع نہیں ملا۔۲۲ر مارچ کو یونیورسٹی کی طرف سے سیر وتفریح کا پروگرام بن سکتا تھا لیکن میں نے بعض پیشگی مصروفیات کی وجہ سے معذرت کر لی۔البتہ ۲۲ر کی صبح خلیل الرحمٰن چشتی صاحب کے صاحب زادے ۹ر بجے مجھے ہوٹل سے لے گئے اور اسلام آباد کے بعض خاص مقامات کی سیر کرائی اور حسبِ پروگرام ایک بجے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (INSTITUTE OF POLICY STUDIES) یا (.I.P.S) پہنچا دیا۔یہ اپنی نوعیت کا ایک اہم تحقیقی ادارہ ہے'اس کا مقصد تعلیم، سیاست، معیشت، صنعت اور ٹکنالوجی کے میدانوں میں عالمی سطح پر جو پالیسیاں وضع کی جاتی ہیں اور جو براہ راست یا بالواسطہ امتِ مسلمہ پر اثر انداز ہوسکتی ہیں، ان کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور آج کے حالات میں اسلام ان کا جو متبادل حل پیش کرتا ہے اسے پیش کیا جائے۔اس کے پس منظر میں خاص طور پر پاکستان ہوتا ہے .I.P.S اب تک ان موضوعات پر 163 کتابیں شائع کر چکا ہے۔سات جرائد ورسائل یہاں سے نکل رہے ہیں۔مختلف موضوعات پر ایک ہزار سے زیادہ رپورٹیں اس کے پاس موجود ہیں۔اس ادارے سے پاکستان اور بیرون پاکستان کی بعض ممتاز شخصیتیں وابستہ ہیں۔اس کی قیادت و سربراہی محترم پروفیسر خورشید احمد کر رہے ہیں۔پروفیسر خورشید احمد عالمی شہرت کے حامل ماہرِ معاشیات ہیں۔وہ حکومتِ پاکستان میں وزیر اور پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیرمین رہ چکے ہیں۔وہ زندگی کے مختلف معاملات ومسائل میں اپنے خطابات اور لکچرس کے ذریعہ اسلام کی

ترجمانی کے فرائض آج بھی انجام دیتے رہتے ہیں۔ان کی اسلامی خدمات پر انہیں ۱۹۹۰ء میں فیصل ایوارڈ مل چکا ہے۔ایوارڈ کے بعد سعودی عرب میں ان کے دوست احباب نے مبارک باد کی تقریب رکھی تھی۔اتفاق سے اس وقت میں سعودی عرب میں تھا۔میں نے بھی اس تقریب میں شرکت کی۔یہ ان سے میری پہلی لیکن رسمی ملاقات تھی۔ جو تبریک وتہنیت سے آگے نہ بڑھ سکی۔اس کے بعد لیسٹر میں ان سے تفصیلی ملاقاتیں رہیں اور علمی وفکری مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔وہ ان اصحاب میں سے ہیں جو اس بے علم کی خدمات کی قدر کرتے ہیں اور برملا اس کے اظہار میں جنہیں تامل نہیں ہوتا۔ان سے ایک طرح کی قربت اور انس محسوس ہوتا ہے۔وہ بار بار کہتے ہیں کہ تمہاری تحریروں کا انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ان کی خواہش میری بھی خواہش ہے لیکن اب تک صرف بعض کتابوں ہی کا ترجمہ ہوسکا ہے۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ مزید تراجم کی کیا صورت ہوگی؟۔

I.P.S. کے ایکزیکیٹیو ڈائریکٹر خالد رحمان صاحب ہیں۔ان کا پس منظر بھی معاشیات کا ہے۔ ادارہ کے عملاً وہی نگراں ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ انہیں بھی میرے موضوعات سے دلچسپی ہے اور بڑے پیمانے پر میری تحریوں کی اشاعت چاہتے ہیں۔

اسلام آباد پہنچنے کے دوسرے ہی روز خالد رحمان صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے اور ۲۲/ مارچ کو تین بجے I.P.S. میں میرا پروگرام طے ہوگیا۔موضوع تھا 'عورت اور معیشت'۔ مجھے اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرنی تھی۔منتخب مجمع تھا۔سو سے زیادہ ہی افراد شریک رہے ہوں گے۔اس میں خواتین کی تعداد بھی کم وبیش ایک تہائی ضرور تھی۔اجلاس کے آغاز میں پروفیسر خورشید احمد صاحب نے اس عاجز کے تعارف میں کہا کہ انہوں نے بعض بالکل نئے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور بعض موضوعات جن پر ہمارے ہاں صرف اشارات ملتے ہیں ان کی تفصیل فراہم کی اور انہیں مدلل کیا ہے۔ان کے ہاں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔پھر بعض نامور شخصیات کے ذیل میں اس عاجز کا نام لیا تو میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہوگئے اور دل اللہ تعالیٰ کے اس احسان سے لبریز ہوگیا کہ اس نے ایک طالب علم کی معمولی خدمات کو یہ وقار اور اعتبار بخشا کہ اہلِ علم انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔

میں نے اپنے خطاب میں عرض کیا کہ اسلام نے معاشی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے۔ بیوی بچوں کا نان نفقہ اس پر لازم ہے۔ ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کی کفالت کا بوجھ بھی بسا اوقات اسے اٹھانا پڑتا ہے اس لئے وہ معاشی جدوجہد پر مجبور ہے۔

عورت پر معاشی ذمہ داریاں نہیں ہیں، اس لئے وہ شرعاً اس کے لئے نہ مجبور ہے اور نہ مجبور کی جاسکتی ہے لیکن معاشی جدوجہد کا حق وہ ضرور رکھتی ہے۔ البتہ اسے دو باتیں پیش نظر رکھنی ہوں گی۔ ایک یہ کہ اس کی خانگی ذمہ داریاں مقدم ہیں، انھیں وہ نظر انداز نہیں کرسکتی، لیکن یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ جوانی میں عورت کی خانگی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتی چلی جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ بہت سی ذمہ داریوں سے عملاً سبک دوش ہوجاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ گھر سے باہر معاشی جدوجہد کے لئے اسے شوہر سے اجازت لینی ہوگی، اس لئے کہ گھر اور خاندان کے نظام کو برقرار رکھنے ہی کے لئے شوہر اس کا نان و نفقہ برداشت کرتا ہے۔ ان امور کی پابندی کرتے ہوئے وہ اخلاقی حدود میں ملازمت، تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کسی بھی میدان میں کام کرسکتی ہے۔ شریعت کی رُو سے وہ اپنے مال و جائداد اور آمدنی کی خود مالک ہے۔ جو کچھ حاصل کرے گی اس کا اپنا ہوگا اور وہ اپنی مرضی سے اس میں تصرف کرسکتی ہے۔ شریعت کے نقطۂ نظر سے وہ صاحبِ نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔ وہ اپنے قریبی عزیزوں کی وارث ہوتی ہے اور اس کی وراثت دوسروں کو منتقل ہوتی ہے۔

تقریر ختم ہونے کے بعد سوالات کا وقفہ تھا۔ سوالات مختلف نوعیت کے تھے۔ ان کا تعلق پاکستان اور عالمی صورت حال دونوں سے تھا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ I.P.S. کی رہنمائی میں خواتین کا ایک گروپ ان مسائل کا گہرائی سے مطالعہ کر رہا ہے اور حکومتِ پاکستان جو اقدامات کر رہی ہے اور معاشرے پر اس کے جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کا بھی اسے شدید احساس ہے۔ آخر میں ڈاکٹر خالد علوی صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں مغربی اقدار اور اسلامی اقدار کے مابین فرق کو واضح کیا اور بتایا کہ ہم اس کی ہر بات کی

تقلید نہیں کر سکتے۔ ہمیں اسلامی تعلیمات، کے پس منظر میں غور کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر انیس احمد صاحب کا نام عرصہ سے سن رکھا تھا۔ غالباً کسی وقت ان سے ہندوستان میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان سے ملاقات کو جی چاہ رہا تھا۔ وہ خود بھی ملاقات کے خواہش مند تھے۔ وہ ایک معروف اسکالر ہیں۔ اسلامی یونیورسٹی ملیشیا میں صدر شعبۂ اسلامیات، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں دعوہ اکیڈمی کے ڈائرکٹر رہے ہیں۔ ایک پرائیوٹ یونیورسٹی Riphah International University کے وائس چانسلر ہیں۔ I.P.S. سے ان کا قریبی تعلق ہے۔ یہاں سے ان کی ادارت میں 'مغرب اور اسلام' کے نام سے ایک سہ ماہی مجلّہ نکلتا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا اردو میں غالباً واحد مجلّہ ہے۔ اس کے ہر شمارے میں کسی نہ کسی موضوع پر مغرب کے اہلِ فکر کے مضامین کا ترجمہ یا خلاصہ پیش کر دیا جاتا ہے۔ اداریہ میں یا الگ سے کسی مضمون میں ان کا نوٹس لیا جاتا ہے۔ وہ سفر پر روانہ ہورہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے I.P.S. میں ملاقات رہی اور تشنگی کا احساس چھوڑ گئی۔

۲۲ رمئی کو I.P.S. سے فارغ ہونے کے بعد 'الفوز اکیڈمی' پہنچا۔ یہ اکیڈمی تعلیم یافتہ اشخاص میں اسلام کا فہم عام کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کے لئے قرآن و حدیث کے دروس کا سلسلہ جاری ہے۔ دینی موضوعات پر مفید کتابیں اور رسائل بھی اس نے شائع کئے ہیں۔ عربی کی تعلیم کا ذوق پیدا کیا جا رہا ہے اور اس کے لیے بعض کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ اس کے صدر جناب محمد خاں منہاس صاحب ہیں جو ملک اور بیرونِ ملک میں اعلیٰ مناصب پر کام کر چکے ہیں اور اس وقت بھی بعض اداروں کو ان کی خدمات حاصل ہیں۔ اس کے سکریٹری مولانا خلیل الرحمٰن چشتی صاحب ہیں۔ ان کی پیدائش ہندوستان کے شہر حیدرآباد کی ہے لیکن انہوں نے ایک عرصہ آسٹریلیا میں گزارا ہے۔ وہاں کی شہریت بھی انہیں حاصل تھی۔ وہ سعودی عرب اور کویت میں بھی رہے ہیں اور اب انہوں نے اسلام آباد کو وطن بنالیا ہے۔ ان حضرات سے ۲۲ ر کی شام کو الفوز اکیڈمی میں میرا پروگرام طے تھا۔ اکیڈمی کی مسجد کی نچلی منزل میں پروگرام تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ خواتین کے لئے الگ نظم تھا۔ میں نے تفصیل سے موجودہ عالمی صورت حال اور عالم اسلام پر ہونے والی فکری یورش کا ذکر کیا اور یہ بتانے کی

کوشش کی کہ ان حالات میں ہمارے کرنے کا کیا کام ہے۔ بڑے صبر وسکون سے حاضرین نے باتیں سنیں۔ بعد میں سوالات بھی ہوئے جن کے جوابات دیئے گئے۔

۲۳؍ کی صبح ۷ بجے اسلام آباد سے کراچی روانگی تھی۔ ۲۳؍ کو پاکستان کا قومی دن منایا جاتا ہے، اس وجہ سے جہازوں کی آمد ورفت متاثر تھی، چنانچہ ساڑھے دس بجے کا اعلان ہوا۔ مولانا خلیل الرحمٰن چشتی نے رخصت کیا۔ لیکن عملاً جہاز نے ۱۲؍ بجے پرواز کی اور 1.45 پر کراچی ائیر پورٹ پر لینڈ کیا۔ میں جہاز سے نکل کر چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک نوجوان میرے نام کی تختی لئے کھڑے تھے۔ جن کا تعلق ائیر پورٹ کے عملے سے تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر ان سے ملاقات کی اور چند ہی منٹ میں ان کے ساتھ باہر نکل آیا، استقبال کے لیے بالکل نئے احباب جمع تھے۔ میرے اور ان کے درمیان سوائے دین کے رشتہ کے اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں زندگی میں دین کا صرف نام لیتا رہا ہوں۔ اس کی برکت ہے کہ بہت سے وہ افراد بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں جن سے میں ناواقف ہوں۔ اگر کوئی شخص دین کی خدمت خلوص کے ساتھ کرے تو دلوں پر اس کی حکم رانی قائم ہو جائے۔ کراچی میں میرا قیام 'قصرِ ناز' میں تھا۔ یہ سرکاری مہمان خانہ ہے۔ یہاں بالعموم پاکستانی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبران اور اسی طرح کے اصحاب ٹھہرتے ہیں۔ یہ بڑی وسیع اور کشادہ عمارت ہے۔ چاروں طرف کمرے اور درمیان میں خوب صورت صحن ہے۔ کمرے بہت صاف ستھرے ہیں۔ احاطے میں چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ پانچوں وقت نماز ہوتی ہے۔

کراچی میں بڑا ہی مصروف وقت گزرا۔ ہر روز کئی ایک پروگرام ہوئے۔ ۲۴؍ مارچ کو جامعہ حنفیہ جانا ہوا۔ یہ جماعتِ اسلامی پاکستان کا قائم کردہ دینی ادارہ ہے یہاں درسِ نظامی کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے ذریعہ مستند علماء دین پیدا ہوں گے۔ یہاں علماء کی تنظیم 'جمعیت اتحاد علماء ' کے نام سے کام کر رہی ہے اور جمعیت طلبۂ عربیہ بھی موجود ہے۔ جامع حنفیہ میں ان سب کا مشترکہ پروگرام تھا۔ میں نے دینی تعلیم کی اہمیت اور علماء دین کی ذمہ داریاں واضح کیں اور بتایا کہ امت کے اتحاد و اتفاق کے لئے علماء کا اتحاد و اتفاق ضروری ہے۔ اس کے لئے اختلافی مسائل میں

وسعتِ ذہن ہونی چاہیے۔ فقہی مسائل میں ہر مجتہد کے پاس دلائل ہیں اس لئے کسی کو برسرِ باطل نہیں کہا جا سکتا۔ اختلافی مسائل پر ہمارے اسلاف نے جو کتابیں لکھی ہیں ان سے اس کی اچھی طرح وضاحت ہوتی ہے۔ یہ نشست ایک گھنٹے سے زیادہ جاری رہی اور مجلس میں موجود علماء نے بتایا کہ اسی نہج پر ان کی کوششیں ہو رہی ہیں۔

اسی روز ادارۂ نورِ حق میں بعدِ مغرب جماعتِ اسلامی کراچی کا اجتماع تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ کارکن جمع تھے۔ کراچی کے امیرِ جماعت ڈاکٹر معراج الہدیٰ صاحب نے جچے تلے انداز میں بہت مفصل تقریر کی۔ حزبِ اختلاف کے ممتاز قائد قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی پاکستان نے بھی خطاب فرمایا اور ملک کی سیاسی، معاشی اور تعلیمی صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس وقت جماعتِ اسلامی پاکستان متحدہ مجلسِ عمل کے ساتھ مل کر کام کر رہی ہے اور بڑے بڑے شہروں میں اس کے کامیاب ملین مارچ نے اس میں شک نہیں ثابت کر دیا ہے کہ وہ ملک کی ایک بڑی سیاسی طاقت ہے۔ میری تقریر دینی و اخلاقی نوعیت کی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کے نصب العین کو لے کر اٹھی ہے۔ اقامتِ دین کا عمل ہر فرد کی ذات سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی سے معاشرے میں دین کی اقامت اور حکومت و ریاست میں دین کی حکم رانی ہوگی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست اور معاشرے میں اللہ کے دین کی حکم رانی ان ہی افراد کے ذریعہ قائم ہوگی جو اپنے اوپر دین قائم کر لیں۔ مجمع نے یہ باتیں توجہ سے سنیں۔

اسی دوران میں نوائے وقت کے ہفت روزہ فیملی میگزین کی معاون مدیر صوفیہ یزدانی نے اپنے ہفت روزہ کے لئے تفصیلی انٹرویو لیا۔ جس میں ملکی اور عالمی مسائل کے ساتھ خواتین سے متعلق مسائل بھی تھے۔ اسی طرح ہفت روزہ 'وجود' کو بھی انٹرویو دیا۔ جس میں خاص طور پر تحریکی موضوعات زیرِ بحث آئے۔

۲۶/ مارچ کے پروگرام میں کراچی یونیورسٹی کو دیکھنا شامل تھا۔ بعض دوستوں کے ساتھ عربی اور اسلامیات کے شعبہ میں جانا ہوا۔ ڈاکٹر نظام الدین منصوری چیئرمین شعبۂ علومِ اسلامی اور ڈاکٹر محمد اسحاق صدر شعبۂ عربی اور دیگر اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ سبھی

احباب اس عاجز سے کسی نہ کسی درجہ میں واقف نکلے۔ اس لئے اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوا۔ بڑی محبت اور یگانگت سے بات ہوئی۔ ڈپارٹمنٹ کی لائبریری دیکھی۔ یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری 'ڈاکٹر محمود حسین لائبریری' بھی سرسری طور پر دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر موضوع سے متعلق نئی نئی کتابیں اور قدیم کتابوں کے نئے ایڈیشن اس قدر تیزی سے سامنے آرہے ہیں کہ آدمی کی پوری زندگی بھی ان کے مطالعہ کے لئے ناکافی ہے۔ وہ کسی بھی موضوع کی صرف منتخب کتابوں ہی کا مطالعہ کرسکتا ہے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ کنٹمپریری اسٹڈیز (I.I.C.S.) کی دعوت پر وہاں حاضری دی۔ یہ ایک نیا ادارہ ہے۔ اس کا مقصد مدارسِ عربیہ کے فارغین کو مختلف موضوعات پر مزید مطالعہ وتحقیق کا موقع فراہم کرنا اور انہیں اس پہلو سے تیار کرنا ہے کہ وہ آج کے حالات میں اسلام کی رہنمائی کا فرض انجام دے۔ یہاں کے طلبہ اور اساتذہ کے درمیان 'عصرِ حاضر میں اجتہاد' کے موضوع پر خطاب رہا۔ بعد میں سوالات بھی ہوئے، ان کا جواب دیا گیا۔

جناب شمیم احمد صاحب مولانا سید ابوالا علیٰ مودودیؒ پر ایک دستاویزی فلم تیار کر رہے ہیں۔ ان سے انٹرویو طے تھا۔ وہ میری قیام گاہ 'قصرِ ناز' میں اپنی ٹیم کے ساتھ بعدِ مغرب پہنچ گئے۔ مولانا مودودیؒ کے علمی مقام ومرتبہ، ان کی خدمات، موجودہ دور میں ان کے افکار وخیالات کی معنویت اور مولانا سے میرا ذہنی وفکری تعلق جیسے بہت سے سوالات زیرِ بحث آئے۔ مولانا مودودیؒ اس دور کے عظیم مفکر تھے۔ بعض نامور خادمانِ دین کے ساتھ ان کا نام آسانی سے لیا جاسکتا ہے، لیکن کسی بھی بڑی سے بڑی شخصیت سے بعض امور میں اختلاف کی گنجائش بہرحال رہتی ہے۔ مولانا مودودی کی بھی ہر بات حرفِ آخر نہیں ہے۔

کراچی کا، بلکہ شاید پاکستان کا سب سے بڑا دینی ادارہ 'دارالعلوم کراچی' ہے جسے حضرت مولانا محمد شفیع عثمانیؒ مفتی اعظم پاکستان نے قائم کیا۔ مجھ جیسے دینیات کے طالب علم کے لئے وہاں حاضری دینا لازم تھا۔ اس کے بغیر کراچی کا سفر ادھورا ہوتا۔ ایک دوست نے حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی سے فون پر رابطہ کیا۔ مولانا ایک ہی روز قبل سری لنکا کے سفر سے

واپس ہوئے تھے اور کسی قدر طبیعت بھی ناساز تھی لیکن اس کے باوجود مولانا نے وقت دیا۔ صبح دس بجے ملاقات ہوئی۔ مولانا اپنی دینی خدمات کی وجہ سے پاکستان ہی نہیں، پورے عالمِ اسلام میں معروف ہیں۔ قرآن وحدیث اور فقہ پر وسیع نظر رکھتے ہیں اور موجودہ دور کے پر پیچ حالات میں رہنمائی کا حق انہیں حاصل ہے۔ مولانا کو میں نے فقہ اکیڈمی حیدرآباد کے اجلاس میں دیکھا تھا۔ لیکن تفصیلی ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ کسی زمانے میں اس عاجز کی کتاب 'عورت اسلامی معاشرے میں' مولانا کی نظر سے گزر چکی تھی، اس لئے وہ نام سے واقف تھے۔ مولانا سے دیر تک بات چیت رہی۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا نے دو اساتذۂ کرام کو ساتھ کر دیا کہ وہ دارالعلوم اور لائبریری وغیرہ دکھائیں۔ دارالعلوم بہت بڑے رقبے غالباً ساٹھ ستر ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے۔ ہر چیز بالکل جدید طرز کی نظر آئی۔ حدیث کی کلاس دیکھی۔ کلاس روم کسی جدید کالج اور یونیورسٹی کا سا تھا۔ ہال میں کرسیاں نیچے سے اوپر کی طرف لگی ہوئی تھیں اور استاذ اسٹیج سے درس دے رہے تھے۔ اس سے طلبہ استاذ کے سامنے ہوتے ہیں اور وہ بھی استاذ کو براہِ راست دیکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ ہمارے بڑے مدارس بھی یہ انداز اختیار کر سکتے ہیں۔ دارالعلوم کی لائبریری کو اسلامیات کی بہت بڑی لائبریری کہا جا سکتا ہے۔ ہر چیز سلیقے کے ساتھ اور جدید انداز میں مرتب دیکھی۔

اس کا افسوس ہے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب کے برادر بزرگ اور صدر دارالعلوم کراچی مولانا محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ سے ملاقات نہیں ہوسکی۔

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی ایک علمی اور تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کی اپنی لائبریری ہے۔ اس کا اپنا مکتبہ اور مطبوعات بھی ہیں۔ اکیڈمی سے معارف فیچر سروس کے نام سے ایک پندرہ روزہ بلوٹین شائع ہوتا ہے جس میں اسلام اور امتِ مسلمہ سے متعلق موجودہ رجحانات کو بغیر نقد وتبصرہ کے پیش کیا جاتا ہے۔ پاکستان کی معروف علمی وسیاسی شخصیت پروفیسر عبدالغفور صاحب اس کے صدر ہیں۔ اکیڈمی میں ان سے ملاقات رہی۔ دوپہر کا کھانا انہیں کے ساتھ تھا۔ اکیڈمی کے رفقاء بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر سید شاہد ہاشمی اکیڈمی کے ڈائرکٹر اور روحِ رواں ہیں۔ اکیڈمی میں 'تخریب کے بعد بھارت میں مسلمان: حال اور مستقبل' کے عنوان پر خطاب

تھا، چھوٹا سا ہال بھرا ہوا تھا۔ میں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی تعلیمی سرگرمیوں کی تفصیل پیش کی اور بتایا کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمان نازک حالات سے گزرے، لیکن وہ اپنے دین وایمان پر ثابت قدم رہے، اپنے تشخص کو باقی رکھا، اپنے اداروں کی حفاظت کی اور ان کو غیر معمولی وسعت دی، نئے دینی ادارے قائم کئے، اسکول، کالج، انجینیئرنگ، میڈیکل اور ٹکنیکل ادارے کھولے۔ سیاسی پہلو سے بھی وہ ایک طاقت ہیں جسے ہندوستان کی کوئی سیاسی پارٹی نظر انداز نہیں کرسکتی۔ وہ اپنی اجتماعی طاقت سے وہاں کی سیاست پر اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ مسلمان ہندوستان میں پندرہ کروڑ ہیں لیکن مختلف ریاستوں میں وہ دو فی صد سے لے کر ۲۳/۲۴ فی صد تک بکھرے ہوئے ہیں (ریاست جموں وکشمیر اس سے مستثنیٰ ہے، وہاں وہ اکثریت میں ہیں) اس وجہ سے کہیں بھی وہ محض اپنے بل پر حکومت سازی کے موقف میں نہیں ہیں۔ انہیں غیر مسلم سیاسی پارٹیوں کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑتا ہے۔ آخر میں صدرِ مجلس پروفیسر عبدالغفور صاحب نے اظہارِ خیال کیا اور اس پر زور دیا کہ پاک وہند کے درمیان جو نزاعی مسائل ہیں ان کے مؤثر حل کی کوشش ہونی چاہیے۔ اس کے بعد بعض دوستوں کے ساتھ کھانا ہوا اور رات گئے 'قصر ناز' واپسی ہوئی۔

کراچی میں میرے حقیقی ماموں کا خاندان رہتا ہے۔ ماموں اور ممانی کا انتقال ہو چکا ہے اور اب ان کے بچے ہیں۔ عرصے سے ان سے خط وکتابت نہیں ہے، اس لئے ان سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکل سکی جس کا افسوس ہے۔ کراچی پہنچنے کے فوراً ہی بعد سید راشد احمد صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ میں کچھ وقت گزارا ہے۔ مجھ سے ایک طرح کا قلبی تعلق محسوس کرتے ہیں اور اب اسلامک ریسرچ اکیڈمی میں خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جب تک کراچی میں قیام رہا انہوں نے میرے ساتھ خاصا وقت گزارا۔ اللہ جزائے خیر دے۔

۲۸/مارچ: آج وطن واپسی تھی۔ صبح 8.40 پر فلائٹ تھی۔ چھ بجے کے قریب ائیر پورٹ راشد صاحب کے ساتھ پہنچا۔ جہاز وقت پر روانہ ہوا اور ٹھیک ۱۱/بجے پاکستان کی بہترین یادوں کے ساتھ دہلی واپس ہوا۔ ☆☆☆